جدید اردو غزل -- مزدور دوست شعری رویّوں کے تناظر میں

ڈاکٹر نثار ترابی

Abstract:

Urdu Ghazal has preserved each tendency philosophic, scholastic, internal, external, romantic, aesthetic, imaginative, spiritual, political, social, and theological in the pages of history; even it has moulded philosophic, mystic, scientific, and labour-friendly issues in its artistic structure along with, demands of the period, multi-dimensional and multifarious categories of the attitudes. It is evident that these all attitudes are articulated in the poetic expressions pivoting the vast directions which contain diverse colours and forms. To the extent of Ghazal, the creative movement that surged from the womb of industrial revolution during 1970s became representative of the labour-friendly poetic style and in consequence, the obligation to represent the working-class was rendered very effectively by numerous poets in the spectrum of altering economic conditions of the time, the same contribution of a few epoch making poets, in creative process, in thought and art, has been dealt with and undertaken in this treatise.

یکم مئی ایک ایسا دن ہے جو دنیا بھر کے مزدوروں کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مزدوروں کے نام ہوئے اس دن کو اب ایک صدی سے بھی زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے۔ یکم مئی ۱۸۸۶ء کو امریکہ کے شہر شکاگو میں پہلی بار روز کی اجرت پر کام کرنے والے محنت کش طبقے نے مل کر اپنے ان اوقاتِ کار کو جن کی کوئی حد مقرر نہیں تھی اور وہ اوقاتِ کار عموماً بارہ گھنٹے سے بھی تجاوز کر جاتے تھے انہیں آٹھ گھنٹے دورانیے تک محدود کرنے کا جائز مطالبہ کیا۔ اس مطالبے کو منوانے کے لئے انہوں نے ایک احتجاجی جلوس نکالا جس پر شکاگو پولیس نے گولی چلا دی۔ جس کے نتیجے میں ہزاروں مزدوروں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یکم مئی ۱۸۸۶ء سے آج تک ہر سال یکم مئی کو دنیا بھر

کے محنت کش یوم مئی مناتے ہیں۔ یہ دن مزدوروں کی تحریک کا عالمی دن کہلاتا ہے اور اس روز دنیا بھر کے مزدور اپنے بنیادی حقوق کے حصول کی جدوجہد کی یاد میں شکاگو کے مزدوروں کی قربانیوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

پاکستان کا شمار دنیا کے ترقی پذیر ممالک میں ہوتا ہے اور تیسری دنیا میں شامل پاکستانی مزدوروں کی اکثریت موجودہ بیداری کے ماحول میں بھی اپنے بنیادی انسانی حقوق کے لئے کوشاں ہے۔ انہیں بنیادی حقوق سے محروم اور انجمن سازی سے دور رکھا جاتا ہے کہ اس طرح کہیں مزدور منظّم ہوکر اپنے جائز مطالبات کیلئے ظالم آجر کے خلاف موثر قوت ثابت نہ ہوسکیں۔ اسلام میں مزدور کی محنت کا اجر اُس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر طاقتور کے کمزور پر ظلم کی قدیم کہانی کے ہر کردار کو ہم آج بھی آسانی سے اپنے معاصر معاشرتی ڈھانچے کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں۔

موجودہ مہذب معاشرے میں سرمایہ دارانہ نظام کے تحت استحصال اور ناانصافی کے جو اذیت ناک مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں وہ نچلے طبقوں کے پسے ہوئے افراد کے لئے قدیم جاگیردارانہ سماج کی پیدا کردہ بھیانک صورتوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ دنیا بھر کے طاقتور افراد اور وڈیرہ شاہی کے نمائندہ کردار آج بھی اس استحصالی نظام کی نمائندگی کرتے ہوئے معاشی طور پر پسماندہ لوگوں کو اُن کے جینے کے حق سے محروم رکھے ہوئے ہیں۔

بالادست قومیں عملی طور پر زیردست اقوام کے پسے ہوئے افراد کو کبھی بھی اپنے برابر کے انسان تسلیم کرنے کا حق نہیں دیتیں اور یوں مظلوم پر جبر کی یہ غیر انسانی روایت مزدور طبقے کو ورثے میں مل چکی ہے اور اسی ظالمانہ اور غیر منصفانہ معاشی روایت کی پاسداری میں ہی بالائی طبقوں کے نمائندہ افراد کی طاقت کا راز پوشیدہ ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد یوں تو انسانی حقوق کے حصول کے لئے بہت پروپیگنڈہ کیا گیا مگر عملاً آج بھی محنت کش طبقہ زندگی کے اُس جبر کو سہنے پر مجبور ہے جس کا احساس کر کے شاعرِ مشرق نے بجا طور پر کہا تھا کہ:

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
تو قادرِ عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندہء مزدور کے اوقات

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے کچھ عرصے بعد جب صنعتی معاشرے کا قیام عمل میں آیا اور لاتعداد گھرانوں نے افلاس کے ہاتھوں مجبور ہوکر اپنے اپنے آبائی گھروں کو چھوڑ کر گاؤں سے شہروں کی جانب ہجرت کی تو ان افراد میں شامل شعرا کا ایک طبقہ بھی موجود تھا جس نے نئے عہد کے صنعتی دُکھ کو اور وقت کے ظالم آجر کے جمہور دشمن نظام سے ملنے والی ذہنی اذیت کو اپنے شعری تجربوں کی بنیاد بنایا تو مزدور دوستی کی حامل شعری روایت کا ایک دبستان وجود میں آ گیا۔ غربت اور بھوک چونکہ ان شعرا کا ذاتی تجربہ تھا لہذا جب یہ تخلیقی تجربہ اُن کے فکری زاویے سے وابستہ ہوا تو اُس میں تاثر و تاثیر کی فطری شدت آ گئی۔

اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی آشوب کو گہرے انسانی دُکھ کے ساتھ بیان کرنے کا وہ رویہ جو ظالم سماج، جابر

قوتوں اور بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کی نئی تاریخ رقم کرتا ہے بیسویں صدی کی شعری عہد کی یادگار ہے اور یہی وہ عہد ہے جب معاشرتی، تہذیبی اور عصری آشوب نے استحصالی نظام کے خلاف شعوری جدوجہد کا جذبہ شدت سے اُبھارا۔ انہیں خودنگری اور خود شناسی کا درس دیا۔ اس تحریک کے پس منظر میں محنت کش کے ادب کی روایت کا ہاتھ ہے۔ محنت کشوں میں ادب کی تخلیق کی روایت پر بات کرتے ہوئے اپنے مضمون میں یوسف حسن رقم طراز ہیں:

> ''جاگیرداری سماج میں محنت کشوں میں سے ادیب زیادہ تر دست کار طبقے میں سے اُبھرے اور اُن میں سے بہت سے ادبِ عالیہ کے خالق بھی ہیں۔ بھگتی تحریک کے اکثر شعرا بھی دست کار محنت کشوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اُردو شاعری زوال پذیر جاگیرداری سماج کے بڑے شہروں میں پروان چڑھی۔ اُس کو پروان چڑھانے میں اُس دور کے صرف ذہنی محنت کرنے والے دفتری ملازمت پیشہ افراد کا ہاتھ ہی نہیں ان کے ساتھ بہت سے شعری دست کار محنت کش بھی شامل تھے''۔(۱)

جب ہم گزشتہ نصف صدی کے شعری ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر واضح ہوتا ہے کہ شہری دست کار محنت کش شعری ادب تخلیق کرنے والے شعرا میں متعدد ایسے ممتاز شعراء کے نام آتے ہیں جنھوں نے اپنی غزلوں میں مزدور دوست روایت کو اس لئے بھی زندہ رکھا کہ دست کار محنت کش ہونے کے باعث محنت کش شعری روایت کا یہ تخلیقی تجربہ اُن کے بخت میں لکھا جاچکا تھا اس سے بچ کے نکلنا محال تھا کہ زندگی گزارنے کی اُن کے سامنے یہی ایک صورت تھی جسے انہوں نے قبول کیا اور یوں اپنے ذاتی تجربے کو اپنے شعری نظریات سے ہم آہنگ کر دیا۔ ان شعرا میں احسان دانش، سید سبطِ علی صبا، رام ریاض، تنویر سپرا، اقبال ساجد، بیدل حیدری، علی مطہر اشعر اور عارف شفیق وغیرہ ایسے شعرا ہیں جنھوں نے اس نوع کے ادب کو اپنے کلام میں باقاعدہ ایک شعری رجحان کے طور پر اور اپنی شاعری کے مرکزی رویے کے روپ میں ظاہر کیا۔ ان شعرا کے علاوہ بھی متعدد شعراء ایسے ہیں جن کے شعری ایوان میں اس رویے کی گونج سنائی دیتی ہے۔ انہیں ہم مزدور دوست شعری روایت کے تناظر میں ذیلی طور پر شامل کریں گے تاہم یہاں مذکورہ تخلقی رویے کے نمائندہ شعرا کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔

احسان دانش (۱۹۱۴ء۔۱۹۸۱ء، زنجیرِ بہاراں) کی شاعری زیادہ تر مزدوروں کسانوں اور غریبوں سے متعلق ہے اور اسی باعث اُنہیں ''شاعرِ مزدور'' کا خطاب بھی ملا۔ اُن کی شاعری کے انسان دوست زاویے نے اُنہیں اگرچہ ترقی پسند شعراء کی فہرست میں لاکھڑا کیا تھا مگر اُن کے ترقی پسندانہ خیالات کے سرے اشتراکیت کی اُن حدود میں شامل نہیں ہوئے تھے جہاں پہنچ کر اشتراکی انتہا پسندانہ سوچ غیر اسلامی افعال کو اپناتی نظر آتی۔ کلامِ دانش میں غریبوں اور مزدوروں کے لئے ایک نئے نظام کے خواہاں ہونے کی گواہیاں جابجا ملتی ہیں۔ ان کے شاعری کے انقلابی پہلوؤں کو زیرِ بحث لاتے ہوئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> ''اشتراکی شاعری ترقی پسند شاعری کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ احسان بھی بڑی حد تک اشتراکی شاعر ہیں لیکن اُس کی اشتراکیت ڈرائنگ روم کی اشتراکیت نہیں اور نہ زمانے کے فیشن

یا ترقی پسندی کے نشان کے طور پر ہے۔ وہ صحیح معنوں میں مزدوروں کا کامریڈ ہے‘‘۔(۲)

بنیادی طور پر ایک مزدور کے ساتھ ایک مزدور کی حیثیت سے کام کرنے کے نتیجے میں احسان دانش کو ایک ایسا شاعر کہا جاتا ہے جن کا مزدور ہونا اُن کا ذاتی تجربہ تھا اور اسی بنا پر اُن کے تخلیقی تجربات میں فنی خلوص محسوس ہوتا ہے:

میرے افلاس نے کھائی نہیں دولت سے شکست
اور اس ملک کے فنکار سے کیا چاہتے ہو
ہیں ثبت مرے دل پہ زمانے کی ٹھوکریں
میں ایک سنگِ راہ تھا جس راستے میں تھا

ڈاکٹر خیال امروہوی (۱۹۳۰ء۔۲۰۰۹ء) کے ہاں مزدور دوست شعری رویے کی ترجمانی ترقی پسندانہ افکار و نظریات کے پس منظر سے اُبھرتی ہے۔

توڑے ہیں کس نے کچے گھروندوں کے آسرے
غربت زدہ دلہن کی ردا کون لے گیا
نظامِ جبر میں جلتے ہوئے نگر دیکھے
نہ دیکھنے کا ارادہ کیا ، مگر دیکھے
گردشِ وقت میں کوئی بھی نئی بات نہ تھی
صبحِ افلاس وہی ، شام وہی دیکھتے ہیں

’’طشتِ مُراد‘‘ (مطبوعہ ۱۹۸۶ء) سید سبطِ علی صبا (۱۹۳۵ء۔۱۹۸۰ء) کا غزلیہ مجموعہ ہے جسے مزدور دوستی کی حامل شعری روایت کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے فلیپ پر رائے دیتے ہوئے آفتاب اقبال شمیم کہتے ہیں:

’’یہ غزلیں اس عصر کی سچی غزلیں ہیں جو ہمارے دور کے تضاد و تصادم کی تاریخ مرتب کرتی ہیں جو ہمارے عہد کے انسان کے حقیقتوں کا عصری حوالہ بن کر گہرے احساس میں زندہ رہنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔‘‘ (۳)

سبطِ علی صبا نے صنعتی معاشرے کے مسائل اور عام انسانی زندگی کے دکھوں، تمناؤں اور دھواں ہوتے خوابوں کی ترجمانی کی۔ آجر کے ہاتھوں مزدور کے حق تلفی کے حقیقت پسندانہ رنگ اُبھارے۔ زر پرست معاشرے کے نمائندہ افراد کی افلاس زدہ سوچوں کی عکاسی اس قدر پُر اثر اسلوب میں کی کہ اُن کی غزل ایک مفلس کے سچے دل کی پکار بن گئی۔

معاش کی مجبوری ایک مفلس شخص کو کس مقام پر لے آتی ہے اس کا اندازہ صبا کے ان شعروں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

کس طرح کروں زحمتِ مہمان نوازی
بچوں کے لئے گھر پہ غذا ہی نہیں ہوتی

غریب گھر کی ضرورتوں کے مقابلے میں
صبا تمھاری مہینے بھر کی کمائی کیسی
جب چلی ٹھنڈی ہوا بچہ ٹھٹھر کر رہ گیا
ماں نے اپنے لال کی تختی جلا دی رات کو

تنویر سپرا (۱۹۳۳ء۔۱۹۹۳ء، لفظ کھر درے) کی شاعری بھی مزدور دوستی کی زندہ روایت کی امین ہے۔ سپرا، نے جاگیردارانہ سماج کے بعد سرمایہ داری کی نئی صنعتی فضا میں نمایاں ہونے والے ماحولیاتی اثرات کی سچی ترجمانی کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ شعری سطح پر جمالیاتی اظہار کے معیاری نمونے صرف بالائی طبقے یا جسمانی مشقت سے آزاد طبقے کے نمائندہ افراد ہی تخلیق نہیں کر سکتے ،اُسے دستکار تخلیق کاروں کی ہنروری بھی چار چاند لگا سکتی ہے مگر یہ شعرا بنیادی طور پر اُس فضاو ماحول میں زندگی گزارنے پر مجبور رہے جو قسامِ ازل نے اُن کی مقدر میں لکھ دی تھی ۔ لہٰذا کہیں کہیں لب و رُخسار کی رنگینِ بیاں کی جھلک دکھانے کے باوجود ان کی شاعری مجموعی طور پر اُسی دھواں دھواں ماحول کو سامنے لاتی ہے جو کارخانوں پر مشتمل فضا کو پیش کرتی ہے۔تنویر سپرا نے جب اپنے تخلیقی فنی جمال کو شعری تجربے سے گزارا تو ایسے زندہ شعر تخلیق کئے جو ہر عہد میں اپنے تخلیق کار کی انفرادیت کا منہ بولتا ثبوت فراہم کرتے رہیں گے:

اے رات مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے
دن بھر کی مشقت سے بدن ٹوٹ رہا ہے

تنویر سپرا شعرا کے اُس طبقے کا نمائندہ ہے جو جوانی آنے سے پہلے ہی بڑھاپا اوڑھ لیتے ہیں:

میں عرصہ شباب کا تھا منتظر مگر
بچپن کے سب نقوش بڑھاپے میں ڈھل گئے

تنویر سپرا کی شاعری مفلس افراد کے اُن بنیادی مسائل و معاملات کو تلخ سماجی حقائق کی روشنی میں سامنے لاتی ہے جو ہر اُس کنبے کی کہانی ہے جس کا تعلق تیسری دنیا سے ہے جو اپنے بنیادی انسانی حقوق کے لئے آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی سسک رہا ہے ۔ یوسف حسن تنویر سپرا کی شاعری کو سچے جدید امکانات اورعصری صداقتوں کی امین قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''وہ سچے امکانات کی ٹھوس صورت پذیری کے لیے ماضی میں سے سقراط، ابوذرغفاری، امام حسن ،منصور اور فرہاد کے کرداروں کو اُجاگر کرتا ہے اور حال میں محنت کش اور اُن کے سچے راہنما اُس کے ہیروں ہیں جن کی قربانیوں سے صداقت پسندی، خیر پرستی اور انسان دوستی کی روایت تابندہ ہے۔'' (۴)

تنویر سپرا کے ہاں محنت کش طبقے کے حقوق کی آواز یوں اُبھرتی ہے:

مزدور ہوں محنت کا صلہ مانگ رہا ہوں
حق دیجئے خیرات نہیں چاہیے مجھ کو
اب تک مرے اعصاب پہ محنت ہے مسلط
اب تک مرے کانوں میں مشینوں کی صدا ہے
آج بھی سپرا اس کی خوشبو مل مالک لے جاتا ہے
میں لوہے کی ناف سے پیدا جو کستوری کرتا ہوں
اب کھیت میں گندم کی جگہ بھوک اُگے گی
اس دور کے انساں سے زمیں روٹھ گئی ہے

محنت کش ادب کے نمائندہ شعرا کے اس قافلے میں بیدل حیدری (۱۹۲۵ء۔۲۰۰۲ء، پشت پہ گھر) کا نام بھی خصوصیت سے شامل ہیں۔ بیدل حیدری، حیدر دہلوی کے شاگردوں میں سے ہیں۔ان کا شمار شعرا کے اُس قبیلے میں ہوتا ہے جو تقسیم کے عمل کے فوراً بعد ہندوستان سے پاکستان ہجرت کر آئے تھے مگر ان کے کلام میں ہجرت کے اس تجربے کو تخلیقی رو میں شامل کرنے کا رویہ اس طرح نمایاں نہیں ہوا جس طور سے ان کے معاصر شعرا کی فکر کا حصہ بنا ۔ البتہ ان کے مجموعہ کلام ''پشت پہ گھر'' (مطبوعہ ۱۹۹۶ء) میں کئی ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں لفظ ''گھر'' کو بنیادی علامت کے طور پر کہیں ایک مفلس کے بے سروسامانی کی حالت کو ظاہر کرنے کی غرض سے اور کہیں لٹے پٹے شخص کی بے آباد کیفیت کو اُجاگر کرنے کی خاطر استعمال کرنے کا تخلیقی رویہ ملتا ہے۔ بیدل کا نظریہ شاعری انسانیت کے وسیع تر احساس کو لے کر آگے بڑھتا ہے ۔اس شاعری کے آئینے میں ایک مجبور اور بے بس انسان کا درد پوری شدت سے دکھائی دیتا ہے:

کُھل گئی میری گلی میں کھلونوں کی دُکان
اور اس پر یہ ستم میرا مکاں ہے سامنے
گھر میں جا کے جب نہ دیکھا جائے بچوں کی طرف
یا کتابیں بیچنی یا گھر کے برتن بیچنا

مزدور دوست شاعرانہ تجربوں کو نئے عہد کی سماجی زندگی کے عقب سے پیدا ہونے والے دُکھوں اور حقائق کو ساتھ ملا کر براہ راست بیان کرنے کا یہ رویہ بیدل حیدری کے ہاں ایک واضح شعری رجحان کی شکل اختیار کرتا ہے۔ جب ہم ۷۰ء کی دہائی میں نمایاں ہونے والے ان محنت کش شعرا کے عہد کو حوالہ بناتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کو پاکستانی معشیت میں اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ پاکستان ایک ترقی پذیر ملک کی حیثیت سے زرعی دور سے نکل کر صنعتی دور میں داخل ہوا ۔ لہذا اس عشرے یعنی ۷۰ء کی دہائی سے نئے شعری تجربات کی وہ نئی تخلیقی رو جو بعض جدید غزل گو شعرا کے ہاں الگ سے دکھائی دیتی ہے اُن میں صنعتی زندگی کے ثمرات یا مضمرات کا ردِعمل ذاتی تجربہ بن کر غزل کے تاروپود میں شامل ہوا۔غزل کی سطح پر نمودار ہونے والے اس

تخلیقی تجربے نے صنعتی ترقی کی ریڑھ کی ہڈی یعنی مزدور کے ذاتی تجربات و احساسات کس طرح سمویا ہے، یہ سب کچھ ہمیں ان شعرا کے کلام کا مطالعہ بتاتا ہے۔

ان شعرا کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اپنے ذاتی تجربات کی عکاسی کے یہ رنگ اس لئے حقیقت پر مبنی ہیں کہ ان شعرا کو صنعتی زندگی اور مزدور کی حیثیت سے ملوں میں کام کرنے کے حالات واقعات سے براہ راست واسطہ پڑا۔ غربت وافلاس کا دُکھ انہوں نے اور اُن کی اولاد نے ذاتی حیثیت سے جھیلا۔ یہی وہی عناصر تھے جنہوں نے شعرا کی تخلیقی ترجمانی کو جب ایک تجربے کی شکل میں غزل کے پیکر میں ڈھلا تو اُس کی تاثیر مسلّم ہوگئی۔ یہ اپنے عہد کا ایسا عصری تقاضہ تھا جس نے آگے چل کر ایک واضح رجحان کی حیثیت حاصل کی۔ اس نوع کے تخلیقی تجربات کے ذیل میں دیگر چند اہم شعرا کے فکر وفن پر انفرادی گفتگو کرنے سے قبل بیدل حیدری کے ہاں ایک مزدور کے حقیقی مسائل کی شعری ترجمانی کے مزید کچھ روپ دیکھتے ہیں:

بھوک چہروں پہ لئے چاند سے پیارے بچے
بیچتے پھرتے ہیں گلیوں میں غبارے بچے
بارش اُتری تو میں سیلاب کی آغوش میں تھا
پانی اُترا تو درختوں سے اُتارے بچے
کل بھی تلاشِ رزق میں گزارا تمام دن
اُڑتا پھرا فضا میں پرندہ تمام دن
بیدل نہ ٹافیاں نہ کھلونے تھے ہاتھ میں
بچے سے شام کرنی پڑی معذرت مجھے
فاقوں سے تنگ آئے تو پوشاک بیچ دی
عریاں ہوئے تو شب کا اندھیرا پہن لیا
گرمی لگی تو خود سے الگ ہو کے سو گئے
سردی لگی تو خود کو دوبارہ پہن لیا

رام ریاض (۱۹۳۳ء۔ ۱۹۹۰ء) بنیادی طور پر جدید غزل کے ممتاز شاعر ہیں۔ اُن کا غزلیہ مجموعہ کلام ''پیڑ اور پتے'' اگرچہ ۱۹۸۶ء میں منظرِ عام پر آیا مگر ان کی شعری پہچان ۷۰ء کی دہائی میں نمایاں ہوچکی تھی۔ رام ریاض ایک ایسا شاعر ہے جو عمرِ عزیز کی ایک قابلِ ذکر زمانی مدت تک تنہائی اور بے روزگاری کے جبر کا شکار رہا۔ فکرِ معاش نے ساغر صدیقی اور اقبال ساجد کے قبیل کے شعرا کی طرح رام ریاض کی بھی ذاتی زندگی ہی نہیں اُس کے خانگی حالات کو بھی دولخت کیا۔ اُسے سنگینِ حالات نے شکست وریخت کے اُس موڑ پر پہنچا دیا تھا جہاں سے کوئی زندہ واپس نہیں آتا ہے۔ ذاتی محرومیوں اور معاشی جبر کے ہاتھوں تلخ حقائق کی ترجمانی میں رام ریاض کا شعورِ شعر متعدد مقامات پر محنت کش شعری راویت کی نمائندگی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ساغر صدیقی اور اقبال ساجد کی طرح رام

ریاض کی شاعری بھی جدید شعرا کے مرکزی دھارے میں شامل نئے فکری وفنی امکانات کی حامل شاعری ہے ۔محنت کش طبقے کی نمائندگی کرنے والے اُن کے واضح شعری رجحان کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ہاتھ خالی ہیں تو دانائی کا اظہار نہ کر
ایسی باتوں کا بڑے لوگ بُرا مانتے ہیں

اس ڈر سے اشارہ نہ کیا ہونٹ نہ کھولے
دیکھے کہ نہ دیکھے، کوئی بولے کہ نہ بولے
زندگی کش مکشِ وقت میں گزری اپنی
دن نے جینے نہ دیا رات نے مرنے نہ دیا
بھوک افراد میں بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
کہیں انسانوں کو انسان نہ کھانے لگ جائیں

سید علی مطہر اشعر (۱۹۳۵ء تا حال،''تصویر بنا دی جائے'') عصری کوکھ سے پھوٹنے والی وہ معاشرتی بدحالی کہ جس نے ہر مقام پر طبقاتی ناہمواری اور سماجی زبوں حالی کو عام کرنے میں مدد دی ، اُس کے مرقعے تلخ سماجی حقائق کی ترجمانی کی صورت میں اپنی شاعری میں یکجا کر دیے۔اشعر کا نام شعرا کی اس فہرست میں شامل ہے جسے معروف معنوں میں متوسط طبقے سے بھی کم تر معاشی درجے میں زندگی گزارنے والا فنکار کہا جاتا ہے۔لہذا فطری طور پر تنگ دستی کا تجربہ فکرِ اشعر کی بالائی سطح پر نمایاں ہوکر اپنی تخلیقی شناخت مکمل کرتا ہے۔سید علی مطہر اشعر کا خاندان بھی سید سبطِ علی صبا اور بیدل حیدری کے خاندان کی طرح ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچا۔لہذا ان کے ہاں بھی سرِ مسافتِ جہاں دھواں ہوتی محفلوں اور گم ہوتے چہروں کا بیاں ایک فکری رویے کے طور پر نمایاں ہے۔ معاشی پسماندگی کے سائے تو ایک آسیب کی طرح اُس وقت سے ان کے بے سروساماں گھر میں پھیلے ہوئے تھے جب اشعر نے اس دنیا میں قدم رکھا تھا۔اس حقیقت کی داخلی شہادت ان کا کلام بھی فراہم کرتا ہے وہ کہتے ہیں:

ماں کی آغوش میں آئے تھے کہ ہم
کاسۂ دستِ گدا میں آئے

یہ الگ بات ہے کہ شاعر اگر کاسہ بدست ہوکر گھر سے نکلنے کا سوچتا ہے تو دفعتاً اُسے خیالِ عزتِ سادات اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے اور پھر وہ تنگ دستی کو اپنا مقدر جان کر اپنا دُکھ شعر میں منتقل کر دیتا ہے:

کاسہ بدست گھر سے نکلتے ہی دفعتاً
اشعر خیالِ عزتِ سادات آ گیا

علی مطہر اشعر کم وبیش گزشتہ چار عشروں سے واہ کینٹ کے صنعتی ماحول میں ایک محنت کش کی حیثیت سے اپنی اور اپنے کنبے کے افراد کی روزی کمانے میں مصروف ہیں۔اُن کے نگارخانۂ فن میں زلف و عارض کے خوش اوقاتی مناظر بھی

کہیں کہیں دکھائی دے جاتے ہیں مگر مجموعی طور پر اُن کی شاعری ایک محنت کش دستکار کے ذاتی حالات و واقعات کی ترجمان ہے اور یہ ذاتی حالات و واقعات انھی کیفیات کا نقشہ پیش کرتے ہیں جسے اس طبقے کے ہر فنکار کے طرزِ احساس میں بنیادی جہت حاصل ہے۔ اس شاعری میں خیال کے سبھی پیکر اُسی بنیادی مسئلے (بھوک) کے دُکھ کے پس منظر میں تراشے گئے ہیں جو تیسری دُنیا کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔اس میں قرض کی مجبوریاں اور معاش کی حضوریاں ہیں۔ بے نوا شخص کے معاشرتی مسائل ہیں۔ اُس کی اور اُس کے بچوں کی بے سروسامانی کے دکھڑے ہیں۔ انسانی رشتوں خصوصاً بچوں کے حوالے سے پیدا ہونے والے مسائل کی ترجمانی ہے۔ کلامِ اشعر قاری پر واضح کرتا ہے کہ معاشی تنگدستی مجبور انسان کو کس ذہنی اذیت میں مبتلا کرتی ہے اور وہ اپنے روزی کے محدود اور طے شدہ گوشوارے کے ساتھ کس طرح زندگی کا پُل صراط عبور کرتا ہے:

ایک چھوٹے سے سیب کو کتنی قاشوں میں تقسیم کروں
کچھ بچوں کا باپ ہوں اشعر کچھ بچوں کا تایا ہوں
دن بھر کی مشقت نے یہ حال بنایا ہے
مجھ کو میرے بچے بھی چہرے سے نہ پہچانیں
مرے بچے ہوائے دشتِ محرومی کی زد پر ہیں
یہ پودے بھی جواں ہوں گے مگر آہستہ آہستہ
وہ ماں بھی گنگ ہے جو مجھ کو پھول کہتی تھی
راہِ حیات نے کانٹوں سے بھر دیا ہے مجھے
وہ سربُلند ہے میری گلی کے بچوں میں
کہ جس کے ہاتھ میں مٹی کا اک کھلونا ہے
مٹی کا کھلونا بھی میسر نہیں آیا
میں اُس کی خوشی لے کے کبھی گھر نہیں آیا

اقبال ساجد (۱۹۳۹ء۔ ۱۹۸۸ء،''اثاثہ (کلیاتِ شاعری) معاشرتی معاشی مصائب کا شکار ہو کر اُن کی تلخی کو اپنی شاعری کا مرکزی موضوع بنانے والے شعرا میں شامل جدید تر اُردو غزل کا ایک معتبر نام ہے۔ اقبال ساجد نے اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ سخت مالی پریشانی میں گزارا۔ یہاں تک کہ انتقال سے چند سال قبل کا عرصہ تو اُس کے سارے کنبے کے لیے مسلسل معاشی بدحالی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ معاشی مسئلے کے موضوعاتی بیان اور بھوک کے مناظر جگہ جگہ بکھرے دکھائی دینے کے باوجود بھی اقبال ساجد کا شمار محنت کش شعرا مثلاً تنویر سپرا اور سید سبطِ علی صبا وغیرہ کی صف میں نہیں ہوسکتا اس لیے کہ اقبال ساجد نے بیروزگاری اور بھوک تو دیکھی مگر معاشی عدم استحکام کے باوجود وہ مل مزدور کبھی نہ بنا۔ البتہ غربت وتنگدستی کے زیرِ اثر رہنے کی وجہ سے اُس کی شاعری میں ایک ایسے احتجاج کا پہلو رجحان کی

شکل میں ضرور ڈھلا جو اُسے مزدور دوست شعری روایت سے جوڑ دیتا ہے۔ معاش کی مجبوری میں جکڑے رہنے والے اور طبقاتی ناہمواری کو تخلیقی تجربے میں شامل کرکے شاعر نے جس نوع کے جداگانہ طرزِ احساس کو نمایاں کیا ہے اُس کے کچھ نمونے درج کئے جاتے ہیں:

دنیا نے زر کے واسطے کیا کچھ نہیں کیا
اور ہم نے شاعری کے سوا کچھ نہیں کیا
غربت بھی اپنے پاس ہے اور بھوک ننگ بھی
کیسے کہیں کہ اُس نے عطا کچھ نہیں کیا
چپ چاپ گھر کے صحن میں فاقے بچھا دیے
روزی رساں سے ہم نے گلہ کچھ نہیں کیا
غربت کی تیز آگ پہ اکثر پکائی بھوک
خوشحالیوں کے شہر میں کیا کچھ نہیں کیا
ہسپتالوں میں یہ کاروبار بھی کرنا پڑا
مجھ کو اپنے خون کا بیوپار بھی کرنا پڑا

عارف شفیق (۱۹۵۶ء تا حال) کا شمار چونکہ اس طرز کی شاعری کرنے والے شعرا میں خصوصیت سے ہوتا ہے لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کی شاعری کی ساری فضا اسی فکری رویے کی بازیافت بن کر اُبھرتی ہے۔ وہ اپنی شعری کلیات ''میں ہواؤں کا رُخ بدل دوں گا'' کے دیباچے میں وڈیرہ پسند سماج کو حوالہ بناتے ہوئے کہتے ہیں:

''کھیتوں میں فصل بونے والے وہ کسان جو روٹی کو ترستے ہیں، کپڑوں کی ملوں میں کام کرنے والے وہ محنت کش جن کے پاس تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا نہیں، عظیم الشان عمارتیں بنانے والے وہ مزدور جنہیں سر چھپانے کے لئے چھت بھی نصیب نہیں...... یہ کچلے ہوئے محروم لوگ اس زمین پر انقلاب لائیں گے۔'' (۵)

محروم طبقے کی نمائندگی عارف شفیق کے ہاں اس طرح شعری صورت اختیار کرتی ہے:

غریبِ شہر تو فاقے سے مر گیا عارف
امیرِ شہر نے ہیرے سے خود کشی کرلی
میں نے اپنے پھول سے بچوں کی خاطر
کاغذ کے پھولوں کا کاروبار کیا

محنت کا صلہ انمول دیا
ہاتھوں میں میرے کشکول دیا

رشیدہ عیاں (۱۹۳۲ء تا حال،''حرف حرف آئینہ، حرفِ اعتبار'')، نثار ناسک (۱۹۴۸ء تا حال)، نصرت صدیقی (۱۹۴۸ء تا حال، لمحہ موجود مطبوعہ ۱۹۸۶ء، ترے طلوع کا لمحہ مطبوعہ۱۹۹۳ء) حسین سحر (۱۹۴۲ء تا حال، ''تخاطب'')،سید عارف، سرور ارمان، سورج نرائن، کاوش بٹ، اختر شاد، سیف الرحمٰن سیفی اورعرفان صادق کے ہاں بھی ہمیں مذکورہ شعری رویے کی نمایاں ترجمانی ملتی ہے۔

وہ جس نے کھیت میں فصلِ حنا اگائی تھی
خود اپنی بیٹی کے پیلے نہ ہاتھ کر پایا
یہ ڈر تھا بچے اسے خالی ہاتھ دیکھ نہ لیں
وہ لوٹ کر نہ سرِ شام اپنے گھر آیا

(رشیدہ عیاں)

مجھ سے لے لے مرے قسطوں پہ خریدے ہوئے دن
میرے لمحے میں میرا سارا زمانہ رکھ دے
میں بھی استحصال کی مٹی میں بوتا ہوں لہو
چاٹتی رہتی ہیں میری قبر جاگیریں تری
بانسری کی لے سسکتی ہے ملوں کے شور میں
دُکھ ایندھن بن گئے رانجھے ترے ہیریں تری

(نثار ناسک)

کس ضرورت کو دباؤں ، کس کو پورا کروں
اپنی تنخواہ کئی بار گنی ہے میں نے
ہائے اس دور کے بے جا یہ تقاضے ہر دم
دل بدلنا ہے کبھی رُوپ بدلنا ہے کبھی

(نصرت صدیقی)

دھواں اُگلتی ہوئی چمنیاں یہ کہتی ہیں
حیات روز سلگتی ہے کارخانوں میں
شاید یہی شدتِ احساس کا مقام
پتھر کا خون تیر رہا ہے کدال پر

(حُسین سحر)

کبھی ان کی طرف بھی دیکھ ، نانِ خشک کی طرح
جو بچوں کی کتابیں اور بستے بیچ دیتے ہیں

(سید عارف)

جس کی مٹھی میں ہے تقدیر ہنر مندوں کی
اپنی صورت کو نمایاں نہیں ہونے دیتا
حاجتیں زیست کو گھیرے میں لیے رکھتی ہیں
خستہ دیوار سے چمٹے ہوئے جالوں کی طرح

(سرور امان)

زمیں پہ رزق ملا بھی تو کیچوے کی طرح
کہ اپنے جسم کی مٹی میں پل گئے ہم بھی
تیری ظلمت کے تُند ریلے میں
بہہ گئی میری شام کی اُجرت
میں اُس مزدور کا بیٹا ہوں سورج
جو اپنے تن کی مٹی ڈھو رہا ہے

(سورج نرائن)

جہاں میں ہوں وہاں بے چارگی، تاریکیاں، حسرت
جہاں تو ہے وہاں فرحت کی کرنیں جگمگاتی ہیں
ہماری جدوجہدِ مسلسل کا یہ خلاصہ ہے
کہ جھانکتی ہے نئی صبح زرد ٹیلوں سے

(کاوش بٹ)

ہیں دفن میری جوانی کے آٹھ سال یہاں
شبانہ روز جبھی تو مشین روتی ہے
بروز عید میں روتا ہوں کارخانے میں
تو دور گاؤں میں اک نازنین روتی ہے

(اختر شاد)

پیٹ کے دوزخ نے ہم کو اس قدر جھلسا دیا
کم نظر لوگوں کی بھی تعظیم کرنی پڑ گئی
اُس کی اپنی بیٹی کی ہتھیلی خشک رہتی ہے
وہ بوڑھا جو دن بھر حنا تقسیم کرتا ہے

(عرفان صادق)

ہم مشقت کی کڑی دھوپ میں رہ کر دن بھر
کیا کہیں شام کو کس حال میں گھر جاتے ہیں
فٹ پاتھوں پہ سونے والے کیا جانیں
پارلیمان میں کون سا بل منظور ہوا

(سیف الرحمٰن سیفی)

بُنیادی انسانی حقوق کے حصول کے لئے پیدا ہوتے ہی جدوجہد کرنے والے بے حال و بے مُراد محروم طبقے کے مظلوم افراد کے لئے انسان دوستی کی یہ شعری روایت جو مزدور دوست شعری رجحان کی تشکیل پا کر غزل کی ہئیت میں ہر عہد کے غزل گو کے ہاں کہیں کم اور کہیں زیادہ شدت سے اُبھری ہے۔ اس کی مثالیں ہر شاعر کے مجموعے سے بآسانی تلاش کی جاسکتی ہیں۔ تاہم موضوع کی گنجائش کے پیشِ نظر یہاں مزید چند شعری نمونے بطور حوالہ درج کیے جاتے ہیں:

نمودِ حُسنِ تجلّی شکار کا دن ہے
وفورِ غنچہ و گُل کے نکھار کا دن ہے
نظامِ جبر و تشدد کی ہار کا دن ہے
یہ گشتگانِ غمِ روزگار کا دن ہے
(نکہت بریلوی- یومِ مئی پر کہی گئی غزل سے)
صبح ہوتے ہی سورج تھام لیتا ہے مری انگلی
مجھے فرصت کہاں تیری گلی میں شام کرنے کی

(جمیل الرحمان جمیل)

نگر نگر میں لُٹنے والے ہم معصوم غریب
گردن ایک ہی ہوتی ہے شمشیر بدل جاتی ہے

(افتخار قیصر)

ہم کو کوئی دشمنی تیرے اسیروں سے نہیں
اے خدا جینے کا حق تو دے مگر مزدور کو

(امتیاز الحق امتیاز)

بھوک انسان کو فٹ پاتھ پہ لے آتی ہے
دل کئی ٹکڑوں میں بٹتا ہے بکھر جاتا ہے

(شوکت مہدی)

کوئی یہاں چمنیوں کے سائے میں قسطوں کی صورت

ضرورت کے عوض اپنی جوانی بیچتا ہے
(جواز جعفری)

نہاتے رہتے ہیں مزدور خوں پسینے سے
تمہارا شہر چمکتا ہے کہکشاں جیسا
(خورشید اکبر)

اگر زمیں سے ہمیں رزق مل نہیں سکتا
تو کیوں فلک سے ہماری غذا نہیں آتی
(افضل گوہر)

ہمارے گاؤں میں بارش نہیں ہوئی اب کے
زمین سوکھ گئی اور لگان سر پر ہے
(انجم جاوید)

یہ اپنی عمر سے آگے نکل گئے کیسے
غریب بچے غبارے اُدھار مانگتے ہیں
(ناصر بشیر)

مزدور دوست شعری روایت کا یہ تسلسل جدید اُردو غزل کا ایک ایسا فکری پھیلاؤ ہے جو مستقبل میں بھی اسی طرح اپنی موجودگی کا پتا دیتا رہے گا۔ محنت کش طبقے کی نمائندگی کا منظوم اظہار غزل کے فکری رویوں میں اس لئے ڈھلا کہ یہ تیسری دنیا کے بیشتر ممالک میں مقیم مظلوموں کی حمایت میں منظوم ہوا ہے۔ جسے ہم بجا طور پر انسان دوستی کے وسیع تر دائرہ احساس کے وسیلے سے گویا شعرا کی جانب سے ایک اظہارِ یگانگت کا نام دے سکتے ہیں۔ تیسری دنیا اور ادب کو زیرِ بحث لاتے ہوئے ڈاکٹر حنیف فوق لکھتے ہیں:

> ''تیسری دنیا کے بیشتر ممالک ایک زمانے تک نوآبادیاتی ظلم وستم کا شکار رہے ہیں اس لئے ان مظلوموں کی حمایت اِن کی ایک ایسی خصوصیت بن گئی ہے جو ان کے ادبیات میں ظاہر ہوتی رہی ہے۔ اگرچہ انسانی فطرت اور عالمِ فطرت سے تعلق کے دائرے مشترک ہیں لیکن تیسری دنیا کے مسائل ترقی یافتہ ممالک کے مسائل سے الگ حیثیت رکھتے ہیں اور یہ فرق ان کے ادب سے بھی ظاہر ہوتا ہے''۔ (٦)

حواشی:

(۱) یوسف حسن ''محنت کشوں کے ادب کی روایت'' مشمولہ ادبی صفحہ **نوائے وقت**(روزنامہ) اسلام آباد۔۲مئی ۲۰۰۰ء۔

(۲) ابواللیث صدیقی (ڈاکٹر) ''جدید شاعری کا ترقی پسند دور'' مشمولہ **نگار**، کراچی (جدید شاعری نمبر) جولائی و اگست ۱۹۶۵ء صفحہ ۳۰

(۳) آفتاب اقبال شمیم۔ فلیپ **طشتِ مُراد**، مجلسِ تصنیف وتالیف واہ کینٹ ۱۹۸۶ء۔

(۴) یوسف حسن ''آہن گر آئینہ گر'' مشمولہ **لفظ کھردرے**، مکتبہ فنون لاہور ۱۹۸۰ء صفحہ ۱۲۶۔

(۵) عارف شفیق ''دیباچہ'' مشمولہ **میں ہوائوں کا رُخ بدل دوں گا**، فرید پبلشرز کراچی، سن ندارد، صفحہ ۱۹۔

(۶) حنیف فوق (ڈاکٹر) ''ادب اور تیسری دُنیا'' مشمولہ **نوائے وقت**، کراچی (ادبی صفحہ) ۱۲دسمبر ۲۰۰۲ء۔

کتابیات:

۱۔ **زنجیر بہاراں**، احسان دانش خزینہ علم وعمل لاہور ۲۰۰۰۔

۲۔ **اثاثہ** اقبال ساجد جنگ پبلشرز لاہور ۱۹۹۰ء۔

۳۔ **پیڑ اور پتے** رام ریاض، جہانگیر بک ڈپو، لاہور ۱۹۹۳ء۔

۴۔ **مقتل جاں** خیال امروہوی جاوید پریس مظفر گڑھ ۱۹۸۳ء۔

۵۔ **طشت مراد** صبط علی صبا مجلس تصنیف وتالیف واہ کینٹ ۱۹۸۶ء۔

۶۔ **میں ہواؤں کا رُخ بدل دوں گا** عارف شفیق، فرید پبلشرز، کراچی، س۔ن۔

۷۔ **لفظ کھردرے** تنویر سپرا مکتبہ فنون، لاہور ۱۹۸۰ء۔

۸۔ **پشت پہ گھر** بیدل حیدری، کاروان پبلی کیشنز، خانیوال ۱۹۹۶ء۔

۹۔ زیرِنظر مضمون میں شامل شعری مثالوں کو متعدد شعراء کے شعری مجموعوں سے انتخاب کیا گیا ہے۔